ZAUQ-E-TAHQEEQ
www.Zauq-e-Tahqeeq.com
editor@zauq-e-tahqeeq.com
ISSN PRINT: 2789-8776
ISSN ONLINE:2789-8784
Volume.6,Issue No.4 (2024)
(October to December)

سر سید احمد خاں کے علمی و ادبی نظریات: جدید تقاضے

Scientific and Literary Ideas of Sir Syed Ahmad Khan: Modern Requirements

قمر شہزاد
ایم فل اسکالر، شعبہ اُردو، سپیریر یونیورسٹی، فیصل آباد
ڈاکٹر مبشر سعید باجوہ
صدرِ شعبہ اُردو، سپیریر یونیورسٹی، فیصل آباد

Qamar Shahzad
M.Phil Scholar, Department of Urdu, Superior University, Faisalabad.
Dr. Mubshar Saeed Bajwa
Head of the Urdu Department, Superior University, Faisalabad

Abstract:
Sir Syed Ahmed Khan is one of the great personalities of the 19th century, who rendered his services for the nation with his deep intellect. He was a great reformer, national thinker and an educationist. He was a skilled grammarian. With his determination, staunch faith and consistent struggle, put an end to the prevailing darkness of ignorance. He wrote for history, politics, archaeology, mass communication, literature, religion and science. Sir Syed Ahmed Khan modernized prose and developed sobriety and piousness in literature. He was fully acquainted with the realm of writing and publishing. He wrote in a so splendid style that even today his style is being applied and followed in Urdu Literature.

Keywords: Sir Syed Ahmed Khan, 19th century, archaeology, mass communication, literature, splendid style

سر سید احمد خاں کی علمی اور ادبی خدمات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے اپنی ہنگامہ خیز زندگی میں سیاسی، مذہبی، ادبی، تحقیقی، غرض ہر قسم کے علمی اور قومی مشاغل میں نمایاں حصہ لیا۔ انھوں نے عمل کے ہر میدان میں اپنا نقش بٹھایا اور ہر جگہ دیرپا اثرات باقی چھوڑے۔ ملکی سیاسیات میں ان کے کارنامے مسلّم ہیں۔ جہاں تک اردو ادب کا تعلق ہے، وہ اردو ادب کے اولین معماروں میں سے تھے۔ تعلیمی معاملات میں ان کے خاص نظریات نے علی گڑھ کی تعلیمی تحریک کی صورت اختیار کی۔ دینیات میں انھوں نے فکر و تصور کے نئے راستے دریافت کیے۔ غرض علم و ادب کے ہر میدان میں انھوں نے مستقل یادگار چھوڑیں۔

سر سید احمد انیسویں صدی کے ان یادگارِ زمانہ عظیم ہستیوں میں شمار ہوتے ہیں جنھوں نے اپنی فکرِ عمیق سے قوم و ملت کی عظیم الشان خدمات انجام دیں۔ وہ مصلحِ اعظم بھی تھے، قومی مدبر اور ماہر تعلیم بھی۔ وہ اردو نثر کے عہدِ زریں کے معمار بھی تھے اور صاحبِ طرز انشاء پرداز بھی۔ وہ عزمِ مستحکم، یقیں محکم اور عمل پیہم لے کر اٹھے۔ وہ افسردہ رسومات اور بے جا توہمات کی آندھیوں کے بیچ جدید علوم کی شمع اپنے ہاتھوں میں لے کر جہالت کی تیرگی کو رفع کرتے رہے اور اس طرح انھوں نے نفسِ سوختۂ شام و سحر تازہ

کرنے کا کام کیا۔ سرسید کی شخصیت ہمالہ کی طرح بلند تھی اور ان کی ذات والا صفات شرافت، دیانت داری اور اخلاق کا مجموعہ تھی۔ وہ برف کی طرح پاک وصاف اور قابلِ رشک شخصیت کے حامل تھے جو کبھی اغیار کے طعن و تشنیع سے بھڑکے نہیں اور اُمتِ مسلمہ کے غم میں ہر لمحہ پگھلتے رہے۔ وہ مختلف او متضاد اوصاف کے مالک تھے۔ وہ تنہا ایک انجمن، ایک ادارہ، ایک دبستان تھے۔ انھوں نے جتنے اور جیسے جیسے عظیم اور قابلِ تعریف کام انجام دیے اور جتنی طرح کی خدمات انجام دیں اس کی توقع ایک انجمن و ادارہ سے بھی نہیں کی جاسکتی ہے۔ سرسید تمام تر سرگرمیوں اور مشغولیتوں کے باوجود اپنے ادبی ذوق کی تکمیل کے لیے کچھ وقت نکال لیتے تھے۔ ان کی ادبی دل چسپیوں کا دائرہ بہت وسیع اور ہمہ گیر تھا۔ تاریخ، سیاسیات، آثارِ قدیمہ، صحافت، ادب، مذہب اور سائنس جیسے تمام موضوعات پر خامہ فرسائی کی۔(۱)

ہم سب سے پہلے سید صاحب کی تصانیف اور اُن کے تصنیفی رجحانات کے ارتقاء کا تذکرہ کرتے ہیں۔

اُن کی تصانیف ارتقاء اور تغیر کا عجیب و غریب نقشہ پیش کرتی ہیں اور اُن کی زندگی کا ابتدائی دور قدیم خاندانی روایات کے بندھن میں بندھا ہوا ہے۔ مولانا حالی نے ڈاکٹر سید عبداللہ کی تصنیف ''سرسید اور ان کے نامور رفقا کی اُردو نثر'' میں سرسید کی تصنیفی زندگی کے تین دور مقرر کیے ہیں: پہلا دور، شروع سے لے کر ۱۸۵۷ء تک، دوسرا دور: ۱۸۵۷ء سے سفر انگلستان (۱۸۶۹ء) تک، تیسرا دور: سفر انگلستان سے وفات (۱۸۹۸ء) تک۔ اس کے پہلے حصہ میں خالص قدیم رنگ جلوہ گر ہے جبکہ دوسرے حصہ میں انگریزوں سے میل جول اور مغربی طرزِ زندگی کی جھلک نمایاں ہے۔ پہلے دور میں سرسید کا نقطۂ نظر خالصتاً علمی اور دینی تھا اس دور میں وہ مسائل حاضرہ کی بجائے تاریخ، مجرد حقائق اور محض علمی تصوّرات کے دل دادہ تھے۔ مناظرہ اور اور عقائد اُن کی جستجو کے خاص میدان تھے۔ مندرجہ بالا دعوے سرسید کی اس دور کی تصانیف سے بخوبی ثابت ہوتے ہیں، اس دور کی اہم تصانیف یہ ہیں:

۱۔ جامِ جم (فارسی) ۱۸۳۹ء اس رسالے میں امیر تیمور صاحبقراں سے لے کر ابو ظفر بہادر شاہ تک ۴۳ بادشاہوں کا مختصر حال ہے۔

۲۔ انتخاب الاخوین۔ یہ رسالہ تقریباً اسی زمانے میں لکھا۔ اس میں قواعد منصفی بیان کیے ہیں۔ سرسید نے اسی زمانے میں خود منصفی کا امتحان دیا تھا اس کی ترتیب میں اُن کے بھائی سید محمد خاں بھی شامل تھے۔

۳۔ جلاء القلوب بذکر المحبوب ۱۲۵۵ھ۔ یہ آنحضرت ﷺ کی سیرت پر مختصر رسالہ ہے۔ مجالس مولود میں جو رسائل پڑھے جاتے ہیں ان میں صحیح روایتیں کم ہوتی ہیں۔ سید صاحب نے اس کمی کو پورا کرنے کے لیے اس رسالے میں ''اس زمانے کے خیالات کے موافق صحیح روایتوں کو جمع کر دیا ہے۔

۴۔ تحفۂ حسن۔ ۱۳۶۰ھ تحفہ اثنا عشریہ کے باب ۱۰، ۱۲ کا اُردو ترجمہ جس میں شیعہ کے بعض اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے۔

۵۔ تسہیل فی جر الثقیل۔ ۱۸۴۴ء بو علی کے ایک فارسی رسالہ معیار العقول کا اُردو ترجمہ۔ جس میں جرّ ثقیل کے پانچ اصول بیان کیے گئے ہیں۔

۶۔ آثار الصنادید ۱۸۴۷ء۔ سید صاحب جب فتح پور سے تبدیل ہو کر دہلی آئے۔ تو اس زمانے میں انھوں نے دہلی کی عمارات کا حال لکھا اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن ۵۴ء میں شائع ہوا۔ ۴۷ء والے ایڈیشن کا اسلوبِ بیان پُر تکلف ہے۔ دُوسرے ایڈیشن میں آسان اور سلیس زبان استعمال کی گئی ہے۔

۷۔ فوائد الافکار فی اعمال الفرجار۔ یہ ان کے نانا کی بعض فارسی تحریرات کا ترجمہ ہے جو انھوں نے پرکار متناسبہ کے اعمال پر لکھی

تھیں۔ یہ اُردو ترجمہ سید صاحب نے دو انگریز عالموں کی فرمائش سے کیا تھا۔

۸۔ قول متین در ابطال حرکت زمین۔ یہ رسالہ زمین کی گردش کی تردید اور آسمان کی گردش کی حمایت میں لکھا ہے (یہ خیال سید صاحب نے بعد میں تبدیل کر لیا تھا، اور بعد میں وہ حرکتِ زمین کو یقینی مانتے تھے۔)

۹۔ کلمۃ الحق۔ ۱۸۴۹ء۔ یہ رسالہ پیری مریدی کے طریقہ مروجہ کے خلاف لکھا۔

۱۰۔ راہِ سنت و ردِ بدعت۔ ۱۸۵۰ء یہ "طریقہ محمدیہ" کی تائید میں لکھا۔ جس میں اہلِ تقلید کے مروجہ عقاید و رسوم کی مخالفت کی۔ اس میں 'وہابی' اثرات غالب نظر آتے ہیں۔

۱۱۔ نمیقہ۔ در بیان مسئلہ تصوّر شیخ۔ ۱۸۵۲ء (فارسی) تصوّر شیخ کی حمایت میں بعض دلائل ایک فرضی خط میں پیش کیے ہیں۔

۱۲۔ سلسلۃ الملوک۔ ۱۸۵۲ء۔ دہلی کے ۲۰۳ بادشاہوں کی فہرست جو پہلے آثار الصنادید کے دوسرے ایڈیشن کے باب اول کے ساتھ تھی، بعد میں الگ شائع کی گئی۔

۱۳۔ کیمیائے سعادت۔ غزالیؒ کے چند اوراق کا اُردو ترجمہ۔ ۱۸۵۳ء

۱۴۔ تاریخ ضلع بجنور۔ ۱۸۵۵ء میں سرسید صدر امین ہو کر دہلی سے بجنور تبدیل ہو گئے تھے۔ وہاں انھوں نے محکمہ کے زیر ہدایت اپنے ماتحت ضلع کی تاریخ قلم بند کی تھی جو غدر میں ضائع ہو گئی تھی۔

پہلے دور میں سرسید کا نقطۂ نظر خالصتاً علمی اور دینی تھا۔ اس دور میں مسائلِ حاضرہ کی بجائے تاریخ، مجرد حقائق اور بعض علمی تصورات کے دلدادہ تھے۔ سرسید کی تصانیف کا دوسرا دور اپریل ۱۸۵۸ء سے شروع ہوتا ہے۔ جب وہ ہنگامہ غدر کے فرو ہونے کے بعد بجنور سے منتقل ہو کر مراد آباد آتے ہیں۔ اس زمانے میں ان کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو غدر میں شرکت کے الزام سے کسی نہ کسی طرح بچایا جائے۔ اس زمانے میں خالص "عقلی" اور "نیچرل" نقطۂ نظر ان کی تحریروں میں نمودار ہو چکا تھا۔ اس دور کی تصانیف کی فہرست یہ ہے:

۱۔ تاریخ سرکشیٔ بجنور: سید صاحب نے بجنور میں واقعاتِ غدر کو جمع کرنا شروع کیا تھا۔ مراد آباد میں آ کر انہوں نے اپنی معلومات کو مرتب اور شائع کیا۔ اس رسالے میں مئی ۱۸۵۷ء سے لے کر اپریل ۱۸۵۸ء تک کے واقعات درج ہیں۔

۲۔ اسباب بغاوت ہند ۱۸۵۹ء: جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے اس رسالے میں بغاوت ہند کے اسباب سے بحث کی ہے۔

۳۔ رسالہ لائل محمڈنز آف انڈیا: ۱۸۶۰ء میں جاری ہو کر ۱۸۶۱ء میں بند ہو گیا۔ یہ اخبار کی طرز کی چیز تھی، اس میں ان مسلمانوں کے حالات بیان کیے جاتے تھے جو۔۔۔ ابتلائے غدر میں انگریزوں کے طرف دار رہے۔ یہ پرچہ اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں شائع ہوتا تھا۔

۴۔ تحقیق لفظ نصاریٰ: اسی زمانے میں سید صاحب کو یہ معلوم ہوا کہ حکومت لفظ نصاریٰ کے استعمال کو بغاوت کا مترادف سمجھتی ہے تو انہوں نے انگریزوں کی غلط فہمی رفع کرنے کے لیے قرآن و حدیث اور لغت کی روشنی میں اس لفظ کی تشریح کی اور بتایا کہ اس کا استعمال اصولاً کسی جذبۂ نفرت یا شائبہ مخالفت کا حامل نہیں۔

۵۔ تاریخ فیروز شاہی: مصنفہ ضیا برنی، یہ کتاب سلاطن ہند کی مستند تاریخ ہے۔ سید صاحب نے اس کو ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کی فرمائش پر ایڈیٹ کیا۔

۶۔ تبیین الکلام: اس کے ذریعے قدیم جغرافیہ اور تاریخ کے مطالعہ کی تحریک چلی۔ اس میں انجیل اور قرآن مجید کی اصولی

وحدت ثابت کی گئی ہے۔

۷۔ سید صاحب نے غازی پور کے قیام کے دوران میں سائنٹفک سوسائٹی قائم کی تھی۔ ۱۸۶۶ء میں سید صاحب نے علی گڑھ سے ایک اخبار نکالا جس کا نام سائنٹفک سوسائٹی اخبار رکھا۔ بعد میں اسی اخبار کا نام علی گزٹ انسٹی ٹیوٹ گزٹ رکھا تھا۔

۸۔ رسالہ احکام طعام اہل کتاب: ۱۸۶۸ء میں اس رسالہ میں یہ ثابت کیا گیا کہ مسلمان انگریزوں کے ساتھ کھانا کھا سکتے ہیں اور اس میں کوئی شرعی قباحت نہیں۔

دوسرے دور کا جائزہ لینے کے بعد جس جذبہ، فکر یا مقصد کا پرچار ہے وہ مسلمانوں کو غدر میں شرکت کے الزام سے بچایا جائے۔ سرسید کی طرف سے دین اور مذہب کی سیاسی تعبیر اور توجیہ ان کے پیشِ نظر رہی۔ تیسرے دور میں ان کے مصلحانہ خیالات میں بڑی شدت پیدا ہو گئی تھی۔ سرسید کی زندگی کا ایک دور وہ تھا جس میں وہ تصور شیخ کے دقیق اور نازک خیالات میں گہری دلچسپی لیا کرتے تھے۔ مگر اس نئے دور میں انہیں معراجِ رسول ﷺ کا جسمانی امکان بھی ناممکن معلوم ہونے لگا۔ ان کے ذہن پر جدید اندازِ فکر نے غلبہ پالیا اور اس کا اثر اتنا گہرا اور پختہ ہو گیا کہ وہ لارڈ میکالے کی طرح سرے سے تمام مشرقی علوم ہی کو ذہن و فکر کے لیے مضر اور مہلک خیال کرنے لگے۔ غرض مذہب، سیاست اور معاشرت کے ہر مسئلے میں ان پر کسی "وکٹورین" صاحب قلم اور صاحب فکر کا دھوکا ہوتا ہے۔ اس دور کی تصانیف یہ ہیں:

۱۔ سفر نامہ لندن: انگلستان سے واپس آکر سید صاحب نے اپنے سفر انگلستان کے مشاہدات و تاثرات قلم بند کرنے شروع کیے تھے۔

۲۔ خطباتِ احمدیہ: یہ سر ولیم میور کی کتاب "لائف آف محمد ﷺ" کے اعتراضات کا جواب ہے۔ اس میں حضرت رسول کریم ﷺ کی ذات بابرکات کو ہر عیب سے مبرا قرار دیا ہے۔ ان خطبات میں سید صاحب نے اپنی تحقیق و جستجو کا اعلیٰ نمونہ پیش کیا ہے۔ پوری کتاب خطبات پر مشتمل ہے۔

۳۔ تہذیب الاخلاق: یہ پرچہ ۲۴ دسمبر ۱۸۷۰ء کو شائع ہونا شروع ہوا۔ اور تین دفعہ نئی زندگی پائی۔ اس میں سید صاحب کے علاوہ ان کے بیشتر رفقاء مضمون لکھا کرتے تھے۔ (۲)

تیسرا دور معترضین کے جوابات، ردِ اعتراضات یعنی مزاحمتی ادب پر مشتمل ہے۔

سرسید احمد خاں کی شخصیت برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کے لیے ایک تحریکی شخصیت کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس بابت محمد ارشد کیانی نے سرسید احمد خاں کی تحریک کے چار بنیادی افکار بیان کیے ہیں:

"۱۔ عقل پسندی اور عقلیت کا نظریہ اور افعال انسانی میں عقل کا مقام۔

۲۔ ترقی پسندی کا نظریہ

۳۔ نظریۂ اجتماعیت

۴۔ خیال۔ ادب کی قوم، کسی ملک اور سوسائٹی کا خام ترجمان ہوتا ہے۔" (۳)

سرسید کی تحریک صرف علمی تھی نہ صرف ادبی۔ بلکہ یہ تحریک تو سیاسی، معاشرتی، تہذیبی، اخلاقی اصلاح کی تحریک تھی اور ظاہر ہے کہ اتنی ہمہ گیر تحریک ٹھوس علمی اور فکری بنیادوں کے بغیر کیونکر وجود میں آسکتی ہے اور اس تحریک کو دوسروں تک پہنچانے اور ان کے دل و دماغ میں اس کے گہرے اثرات کو جانشین کرنے کے لیے قلم و قرطاس کے بہت سے بہتر استعمال کی ضرورت ہوتی

ہے لہٰذا یہ تحریک علمی ہونے کے ساتھ ساتھ ادبی بھی تھی۔ کسی علمی اور فکری تحریک فکر و نظر اور عمل و تجربے نے سرسید کے اصلاحی اقدامات میں حسن اور نکھار کی رنگ آمیزی کی اور ان کی کوششوں سے اس راہ پر سرسید کے ابتدا، سادہ اور بے ڈھب نقوش میں حسن و دلآویزی اور ہنر مندی و سلیقہ مندی کی ایسی چھب آ گئی کہ یہی طرز اور یہی اسلوب اردو ادب کا مروجہ اسلوب بن گیا۔ تحریکِ اصلاح سے پہلے بھی سرسید تصنیف و تالیف کے شغل سے آشنا تھے چنانچہ آثارالصنادید اور کئی دوسرے رسالے ان کے اس شوق کی تکمیل کا مظہر ہیں۔ لیکن اپنی تحریک کے بعد جب ان کا اندازِ فکر بدل گیا تو ان کی ادبی کاوشیں بھی یکسر تبدیل ہو گئیں۔ مضامین تہذیب الاخلاق، خطاباتِ احمدیہ، اسباب بغاوت ہند، تبیین الکلام، تفسیر القرآن اور دیگ تصانیف ان کے ادبی نظریات کو عملی ثبوت پیش کرتی ہیں۔ یہ ان کی تحریک کی دکھائی ہوئی راہیں تھیں جن پر چل کر اردو شاعری میں حقیقت پسندی، افادیت اور صداقت کی روش اپنائی گئی۔

تاریخ و سوانح نگاری اور تبصرہ و تنقید کی صحت مند اور گراں قدر روایات استوار ہوئیں اس لحاظ سے سرسید کی تحریک ایک عظیم ادبی تحریک بھی کہلائی جاسکتی ہے۔ لیکن اسے صرف ادبی تحریک یا علمی تحریک کا نام دینا سرسید کے عظیم اور ہمہ گیر کارنامے کی وقعت کو کم کرنے کے مترادف ہے۔ الغرض سرسید کی تحریک ایک بھرپور، فکری و نظری اور اصلاحی و عملی تحریک تھی، جس نے علم و ادب کے خیابانوں کو سینچا اور سنوارا اور اس سے اپنے مقصد اور مشن کے لیے بیش از بیش کام لی۔ ادبی میدان میں سرسید احمد خاں کی خدمات کے حوالے سے محمد ارشد کیانی رقم طراز ہیں:

> "ادبی میدان میں بھی تہذیب الاخلاق کے اثرات بڑے واضح، معین اور قطعی ہیں۔ سرسید نے خود کہا کہ "ہمارے اس پرچے کا مقصد قوم کی عام خدمت، تہذیب اور تربیت تھا مگر ہمارے اس پرچے سے علمِ ادب اور علم انشاء کو بھی بہت فائدہ پہنچا۔ ان باتوں سے سرسید کا مقصد یہ ہے کہ (۱) ادب کا نظریہ واضح کیا۔ (۲) ادب کے لیے ایسے سانچے اور نمونے پیش کیے جن سے اور ادیب متاثر بھی ہوتے ہیں اور مستفید بھی ہو سکتے ہیں۔ (۳) ادب کو اس روش سے بچایا جو بالکل فضول تھی اور اس میں کوئی علمی چاشنی نہیں تھی۔ سرسید نے ادب کو پرانی چیزوں کو کھوکھلے پن سے بچانے کی کوشش کی۔ سرسید اور ان کے رفقا کی تحریروں نے "تہذیب الاخلاق" کے ذریعے آنے والے ادب ڈرامہ، ناول، انشائیہ، تاریخ نگاری، سوانح نگاری حتیٰ کہ فلسفہ لکھنے والوں کو بھی متاثر کیا۔"(۴)

سرسید احمد نے مذہب اور تعلیم کو اپنی تحریک کا خاص موضوع بنایا۔ علی گڑھ تحریک بنیادی طور پر تعلیمی اور ثقافتی تحریک تھی۔ سرسید احمد نے محسوس کیا تھا اور یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ تعلیم کے بغیر کوئی قوم ترقی کی راہ پر گامزن نہیں ہو سکتی۔ جہالت تمام طرح کی برائیوں اور تمام طرح کی خرابیوں کو جنم دیتی ہے۔ اس لیے سرسید نے اپنی تحریک میں تعلیم کو مرکزی حیثیت دی اور مذہب کی حفاظت کے لیے سینہ سپر ہونے کی تاکید کی۔ ان خیالات و نظریات کی تائید علامہ اقبالؔ کے اس شعر سے ہوتی ہے:

نہیں ہے ناامید اقبالؔ اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی(۵)

انگریزوں کے ہندوستان پر تسلط و اقتدار کے بعد مسلمانانِ ہند بے یار و مددگار ہو کر رہ گئے اور ان کی زندگی کے تمام شعبے اور ادارے اس تباہی کے شکار ہوئے۔ تعلیمی، معاشی و اقتصادی، معاشرتی ملازمتوں اور روزگاروں غرض تمام سہولتوں سے سوچے سمجھے

منصوبے کے تحت انھیں محروم و بے دخل کر دیا گیا اور سب سے زیادہ فکر کی بات یہ ہے کہ ان کے دین و مذہب پر بھی خطرے کے بادل منڈلانے لگے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عیسائی مشنری و مبلغین، حکومت کی سرپرستی میں سرگرمِ عمل ہو گئے اور سر ویلیم میور نے رسول اللہ ﷺ کی شان میں اپنی کتاب ''لائف آف محمد'' میں نازیبا و ناشائستہ خیالات کا اظہار کیا جس کے جواب میں سرسید احمد نے ''خطباتِ احمدیہ'' لکھ کر ان تمام نظریات و خیالات کی تردید میں ۱۲ مقالے لکھے جو حسب ذیل ہیں:

۱۔ جغرافیہ جزیرہ ہائے عرب مع نقشہ عرب۔
۲۔ قبل اسلام کے عربوں کے رسم و رواج۔
۳۔ قبل اسلام عرب کے مذاہب۔
۴۔ اسلام ساری انسانیت کے لیے رحمت ہے اور سابقہ انبیا کے مذاہب کی حمایت و مدافعت کرتا ہے۔
۵۔ کتب احادیث و تفسیر و فقہ کے بیان میں
۶۔ مذہب اسلام کی روایتوں کی اجازت اور ان کے رواج کی ابتدا۔
۷۔ قرآن کا نزول کس طریقے سے ہوا۔
۸۔ قبل اسلام کا کعبہ اور اس کے گزشتہ حالات۔
۹۔ رسول اللہ ﷺ کی سنت نامے کے بیان میں۔
۱۰۔ توریت اور انجیل میں آنحضرتؐ کی بشارت۔
۱۱۔ شقِ صدر کی حقیقت اور معراج کی ماہیت کا بیان۔
۱۲۔ آنحضرتؐ کی زندگی کے ابتدائی بارہ سال کے واقعات۔(۶)

سرسید مرزا غالب کی طرز سے مستفید ہوئے:

> ''اردو انشا پردازی کا جو آج انداز ہے اور جس کے مجدد اور امام سرسید مرحوم تھے۔ اس کا سنگِ بنیاد دراصل مرزا غالب نے رکھا تھا۔ سیّد صاحب اور غالب کے معاصرانہ تعلقات کو دیکھ کر یہ ماننا پڑتا ہے کہ مرزا کے طرز خاص کا سیّد صاحب پر ایک خاص اثر پڑا اور جو سادگی اور بے تکلفی ان کی عبارت میں پائی جاتی ہے اس کا نقشِ اوّل غالب کے ہاتھوں صورت پذیر ہو چکا تھا۔''(۷)

البتہ یہ حقیقت ہے کہ مرزا غالب کی جدت طرازی صرف خطوط تک محدود ہے لیکن سرسیّد کو یہ شرف حاصل ہے کہ انہوں نے جدید نثر کو ترقی دے کر اردو میں سنجیدہ، متین اور صالح ادب پیدا کیا۔ علمی مسائل، مذہب، تعلیم، معاشرت، سیاست، فلسفہ، تاریخ، ادب و صحافت کے لیے انہوں نے اپنے سنجیدہ ذوق سے زبان میں شائستگی کا معیار قائم کر دیا۔ عبادت آرائی کے بجائے مضمون و موضوع کو مرکز توجہ بنانے کی روایت کا آغاز غالب اپنے خطوط کر چکے تھے۔ مولانا شبلی نعمانی نے سرسید اور اردو لٹریچر کے عنوان کے تحت ایک جگہ لکھا ہے کہ اردو انشا پردازی کا جو آج انداز ہے اور جس کے مجدد اور امام سرسید مرحوم تھے۔ اس کا سنگِ بنیاد دراصل مرزا غالب نے رکھا تھا۔ سرسید کو مرزا سے جو تعلق تھا وہ ظاہر ہے۔ اس لیے کچھ شبہ نہیں ہو سکتا کہ سرسید مرزا کی طرز سے مستفید ہوئے۔ لیکن مرزا غالب کی جدت طرازی صرف خطوط تک محدود ہے۔ مگر سرسیّد کو یہ شرف حاصل ہے کہ انہوں نے جدید نثر کو ترقی دے کر

اردو میں سنجیدہ، متین اور صالح ادب پیدا کیا۔ علمی مسائل مذہب، تعلیم، معاشرت، سیاست، فلسفہ، تاریخ، ادب و صحافت کے لیے انہوں نے اپنے سنجیدہ ذوق سے زبان میں شائستگی کا معیار قائم کر دیا۔ اس بابت ڈاکٹر خواجہ زکریا رقم طراز ہیں:

> "میں سرسید کو پہلا انشائیہ نگار سمجھتا ہوں۔ اگر انشائیہ کے لیے تحریر کی غیر معمولی سنجیدگی کو مضر سمجھا جائے تب بھی سرسید کے کئی مضامین انشائیہ کی ذیل میں آجاتے ہیں۔"(۸)

ڈاکٹر سید عبداللہ کے مطابق:

> "سرسیّد نے نثری اسلوب کے ارتقاء میں کیا خالص حصہ لیا؟۔۔۔ اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ انہوں نے انشاء کی پرانی رسموں کو توڑ کر نثر کو تمام علمی اور ادبی مضامین کے لیے ذریعہ اظہار بنا دیا۔ طرزِ ادا کے مقابلے میں مدعانویسی اور مطلب نگاری کو تحریر کا مقصد اصلی ٹھہرایا۔ انہوں نے تحریر کی جذباتی بنیادوں کی اہمیت جتلائی۔۔۔ اور یہ ثابت کیا کہ تحریر میں اثر باہر سے نہیں آتا بلکہ اس کا سرچشمہ لکھنے والے کے قلب میں ہے۔ سرسیّد کا سب سے بڑا کارنامہ علی گڑھ تحریک کو بظاہر صرف سیاسی اور محض تعلیمی تحریک خیال کیا جاتا ہے۔ یہ ایک لحاظ سے ایک علمی اور ادبی تحریک بھی ہے۔ علمی اس معنی میں یہ اس تحریک کے زیرِ اثر فکر و نظر میں اہم انقلاب نمودار ہوا اور مذاق تصنیف میں گہری تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔ ملک میں مغرب سے استفادہ کرنے کے لیے جو میلان پیدا ہوا۔ اس کے ماتحت جس طرح انداز نظر بدل گئے اسی طرح معانی اور موضوعات میں بھی تغیر پیدا ہوا۔ ادبی لحاظ سے علی گڑھ تحریک کے اثرات اور بھی وسیع اور دوررس معلوم ہوتے ہیں۔ نہ صرف اسلوبِ بیان اور رُوح مضمون میں بلکہ ادبی انواع کے معاملے میں بھی نامور ان علی گڑھ کی توسیع کوششوں نے بڑا کام کیا۔ سوانح نگاری کا مبداء اور بڑا سرچشمہ تحریکِ سرسیّد سے ہی نکلتا ہے۔"(۹)

سوانح نگاری کا مبداء اور بڑا سرچشمہ تحریکِ سرسید سے ہی نکلتا ہے۔ ان سوانح نگاروں نے سوانح نگاری کو فنی اصولوں کے مطابق آگے بڑھایا۔ شخصیت کی مکمل تصویر، صداقت اور حقیقت کی تلاش اور حسن ترتیب اور حسن انتخاب ان کی سوانحی عمری کا ایک خاص امتیاز ہے۔ تاریخ نگاری کا علمی انداز بھی اردو میں اسی دور میں پیدا ہوتا ہے۔ شبلیؔ، شررؔ، ذکاءاللہؔ اس دور کے بڑے مورخ ہیں۔۔۔ آزاد اگرچہ اس حلقے سے باہر ہیں مگر اس زمانے کی ہواؤں سے وہ بھی آزاد نہیں۔ شبلی کے شاگردوں اور رفیقوں نے اسلامی تاریخ کی تحقیق کا کام آگے بڑھایا۔۔۔ شبلیؔ کے کارناموں کو ہم علی گڑھ سے جدا کر کے نہیں دیکھ سکتے۔ ہر چند کہ ان کا مرکز بدل گیا تھا۔۔۔ ناول بھی اسی حلقے کے گردوپیش سے نمواد ہوئی۔ مولوی نذیر احمد سرسید کے رفیق خاص تھے۔ انہوں نے اُردو میں قصے لکھ کر ناول کو مقبول بنایا اور زندگی کے بعض مسائل کی ترجمانی کے ذریعے ادب اور زندگی کا رابطہ قائم کیا۔ شررؔ (جو سرسیّد کے دائرے کے ایک بزرگ ہیں) تاریخی ناول نگاری میں بڑا نام پاتے ہیں اور ناول کی ترقی کا قدم آگے بڑھتا ہے۔ مقالہ نگاریؔ بھی سرسید کے طفیل اردو میں ایک مقام حاصل کرتی ہے۔ "تہذیب الاخلاق" کے مقالہ نگاروں میں سرسید کے بیشتر رفقائے عظام کے نام نظر آتے ہیں۔ ان کے زیرِ اثر کچھ

مدت کے بعد اردو میں مقالہ نگاری کا فن ہمارے بڑے فنونِ ادبی کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔ محسن الملک، وقار الملک، چراغ علی، شبلی، حالی کے مقالے اردو کے ادب میں بلند تر مرتبہ رکھتے ہیں۔(۱۰) ایک اور مقام پر ڈاکٹر سید عبد اللہ، سرسید کی سوانح عمری کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

> ''سوانح عمری کا فن جن جذباتی اور شخصی خصائص سے ابھر کر نمو پاتا ہے، ان کی سرسید میں شاید کمی تھی، یا دراصل اس فن کی تربیت کسی فرد سے الفت و انس کے جذبے سے ہوتی ہے۔ اس لیے سخت گیر آدمی سوانح نگار نہیں بن سکتا۔ سرسید بھی ایک سخت گیر آدمی تھے، ان کا ذہن کڑی ضابطہ پسندی کا عادی تھا، وہ سخت منطق کی چابک سے ہانکنے والے شخص تھے۔ ان کی اس طبیعت نے ان کو سوانح نگاری کے میدان میں اترنے نہ دیا۔ اس معاملے میں ہم خود سوانح نگار شبلی کو کوئی آئیڈیل سوانح نگار قرار نہیں دیتے، وہ بھی طبعاً ادیب ہی تھے، اس کے بعد وہ مورخ تھے۔ سوانح عمری کو تو انہوں نے خواہ مخواہ مجروح کیا، یعنی سوانح عمری کو تاریخ یا بعض دوسرے مطالب و معلومات کے اظہار کا ذریعہ بنایا، اسی لیے ان کی سوانح عمری میں ''شخصیت'' کے سوا سب کچھ ہے۔ ان باتوں کے باوجود اردو کی سوانح عمری عرصے تک سرسید کی تحریک سے متاثر رہی۔ یہ اس طرح کہ اس دور کی ساری سوانحی نگاری قومی ترقی کے مقصد سے فروغ پاتی رہی اور قوم کی ترقی سرسید کی تحریک کا اصول اولین تھا۔''(۱۱)

بقول عبد اللہ:

> ''سرسید احمد خاں اردو نثر کے باوا آدم ہوں یا نہ ہوں، اردو مضمون نگاری کے باوا آدم ضرور تھے اور باوا آدم بھی ایسے جو بہشت کی سیر بھی کر آئے تھے۔''(۱۲)

سرسید احمد خان محض مصلح ہیں۔ اعلیٰ مضمون نگار پہلے ادیب ہوتا ہے پھر مصلح ہو سکتا ہے۔ ایڈیسن، سٹیل گولڈ سمتھ اور دوسرے بلند پایہ مضمون نگار پہلے ادیب تھے پھر مصلح۔ سرسید احمد خاں معلم اخلاق پہلے تھے ادیب بعد میں۔ ان کے نزدیک تمام اعمال انسانی کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان ''مفید'' کام کرے خواہ اپنے لیے خواہ دوسروں کے لیے ان کے نزدیک دنیا اور دین دونوں کا منتہا یہی ہے کہ انسان کسی کے کام آئے۔ بقول حالی:

یہی ہے عبادت یہی دین و ایماں
کہ کام آئے دنیا میں انساں کے انساں(۱۳)

سرسید اردو کے ایڈیسن یا سٹیل نہیں تھے۔ ہم انہیں جزوی طور پر ڈرائڈن اور بیکن کا مماثل قرار دے سکتے ہیں۔

بیکن اور سرسید اس لحاظ سے باہم مماثلت رکھتے ہیں کہ دونوں اعمال کی مادی اور دنیاوی منفعتوں کو ابھارتے ہیں۔ ان کے نزدیک ''اچھے کرم'' وہی ہیں جن کا کچھ ''پھل'' ملتا ہے۔ سرسید کے ہاں جذباتی اقدار کا ایک خطیبانہ تصور پایا جاتا ہے۔ دونوں میں ایک بڑا فرق بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ سرسید کے قول و فعل میں بڑی سچائی اور صداقت ہے جو بیکن کے قول و فعل میں شاید نہ تھی۔ سرسید اور

ڈرائڈن کے درمیان مماثلت کا ایک پہلو ہے اور یہ کہ دونوں نے قوم کے ادبی مذاق کی اصلاح کی طرف قدم بڑھایا۔

خالص شاعری کے متعلق بھی سرسید کا نقطۂ نظر اجتماعی اور افادی ہے۔ سرسید نے شاعری کو تہذیب اور شائستگی کا لازمہ اور وسیلہ خیال کیا ہے۔ مولانا حالیؔ کا مقدمہ شعر و شاعری تقریباً انہی خیالات کی زیادہ منظم اور مربوط تفسیر ہے۔ شاعری کا اجتماع کے لیے مفید ہونا اور اس کی افادی اور تعمیری صلاحیت یہ سب امور سرسید کے اشاردات کی صدائے بازگشت ہے۔

سرسید اپنے خیالات کے اظہار میں اتنے بے تکلف ہو چکے تھے کہ لفظوں کی خوبصورتی اور فقروں کی ہم آہنگی کی کوئی پروانہ کرتے تھے باوجود کہ وہ اس کی صلاحیت رکھتے تھے۔ سرسید کے یہاں کوئی الفاظ، فقروں اور ترکیبوں کے انتخاب میں کوئی مخصوص اصول نہیں پائے جاتے وہ مقصد کی تہہ چلے جاتے ہیں۔ ان کی تحریریں یقین و اعتماد اور زور پیدا کرنے والی ہیں۔ مگر محظوظ اور مسرور کم کرتی ہیں۔ یہ حسن کی کمی سرسید کی تحریروں یا ان کے اسلوب کا خاصہ ہے لیکن اس سے سرسید کو یہ فائدہ پہنچا کہ ان کی تحریر ہمہ رنگ خیالات کو ادا کرنے کے قابل ہوئی اور انہوں نے دوسرے مسلک والوں کو بتایا کہ میں نثر میں ہر قسم کے علمی مضامین ادا کیے جاسکتے ہیں۔ مولانا حالی نے حیاتِ جاوید میں لکھا ہے:

> ''سرسید نے جو کچھ لکھا ہے بے تابانہ لکھا ہے، بے قرارانہ لکھا ہے اور وہ یوں ہی ہے کہ کسی شخص کے گھر میں آگ لگی ہو تو وہ لوگوں کو پکارے کہ آؤ اس آگ کو بجھاؤ۔ اس میں الفاظ کی ترتیب، فقروں کی ترکیب کا خیال نہیں ہوتا یوں کہ ان کے پاس ایک دعوت تھی، اس دعوت کو دینے کے لیے انہیں جو بھی الفاظ ملے بیان کر دیے۔''(۱۴)

سرسیّد احمد خاں کی نثر سے اردو میں اسلوبِ نثر کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ سرسیّد نے ''تہذیب الاخلاق'' میں اپنے مضامین میں پرانے اسلوب پر بہت کچھ تنقید کی ہے۔ ان کا پرانے اسلوب نگارش پر سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ پرانے لکھنے والے اکثر تصنع اور بناوٹ سے کام لیتے ہیں اور وہ کچھ سیکھتے ہیں جو ان کے دل میں نہیں ہوتا۔ وہ بات کو صاف صاف اور سادہ زبان میں کہنے کے بجائے آراستہ و پیراستہ زبان میں ادا کرتے ہیں۔ ان کے یہاں تخیل پر ضرورت سے زیادہ زور دیا جاتا ہے ی اور بنی بنائی ترکیبیں، منشیانہ جملے اور فقرے پائے جاتے ہیں۔(۱۵) اس ضمن میں آلِ احمد سرور نے لکھا ہے:

> ''سرسید کے مقاصد کا ترجمان ان کی آرزوؤں اور حوصلوں کا آئینہ دار تہذیب اخلاق تھا۔''(۱۶)

سرسید لفظوں کے استعمال میں فصیح اور غیر فصیح الفاظ کے درمیان فرق کرنے کی فرصت نہیں پاتے۔ سرسید نے خود کہا ہے: ''ایک سر و ہزار سودا'' رکھنے والے ذہن کی کم فرصتی اس بات کا موقع نہیں دیتی کہ وہ تراکیب پر غور کرے۔ بعض اوقات ترکیب بناتے وقت سرسید فارسی اور عربی کے الفاظ کو انگریزی کے الفاظ کے ساتھ پیوند کر دیتے ہیں۔(۱۷)

سرسید کے الفاظ میں ایک اور چیز جو کھٹکتی ہے وہ یہ ہے کہ سرسید ان روزمروں اور محاوروں کا استعمال کر جاتے ہیں جنہیں جہلا استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً ہم یوں کہیں کہ ''میں یہ کام کر کے دوسری جگہ گیا'' لیکن سرسید اس کو یوں لکھیں گے کہ ''یہ کام کر کے میں دوسری جگہ گیا۔'' دہلی کے فصحاً ''کر کر'' نہیں بولتے بلکہ کر کے بولتے ہیں ایک اور چیز جو سرسید کے الفاظ میں تکلیف دہ محسوس ہوتی ہے وہ انگریزی الفاظ کا بکثرت اور بہ افراط استعمال ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو زبان مہمان نواز زبان ہے اور یہ ہر زبان کی لفظی صوتیات کو بھی قبول کر لیتی ہے اور یہی وصف اس کی وسعت اور بقا کا ضامن اس لیے انگریزی الفاظ کا استعمال کوئی زیادہ بری بات

نہیں لیکن اسے ایک حد کے اندر رہنا چاہیے اور انگریزی الفاظ کا استعمال صحیح ہونا چاہیے۔ سرسیّد کی تحریر میں انگریزی الفاظ یوں ابھرے ہوئے ہیں جیسے فرش کی زمین پر ایک اینٹ ابھری ہوئی ہو۔ سرسید کی تحریروں میں حقیقت زیادہ ہے اور افسانویت کم ہے۔ انہوں نے اپنے عمل سے یہ ثابت کیا کہ ادب فرد کے دل کی سچی آواز ہی نہیں بلکہ جمہور اور اجتماع اور قوم کے دل کی سچی آواز اور ایسی سچی آواز ہے جو اپنے دل کا غبار نکالنے کے لیے بلکہ جمہور کی اصلاح و ترقی اور تکمیل کے لیے اٹھائی جاتی ہے۔(۱۸) سرسید نے ادب کی ماہیت اور اس کے نصیب العین کے متعلق پرانے نقطۂ نظر کی اصلاح کی انھوں نے یہ بتایا کہ ادب کی تخلیق میں قاری کا وجود بھی بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔

> ''جو اپنے دل میں ہو وہی دوسرے کے دل میں پڑے تاکہ دل سے نکلے اور دل میں ہی بیٹھے۔''(۱۹)

بمطابق ڈاکٹر سید عبداللہ تاریخ کے متعلق سید صاحب کا نقطۂ نظر واضح ہے۔ وہ عملی ضرورتوں اور جدید اجتماعی مسائل کو اتنی اہمیت نہیں دیتے تھے کہ انھوں نے ایک مرتبہ ایک خط میں یہ لکھا ''ہم دعا کرتے ہیں کہ خدا کرے مولوی شبلی ''الفاروق'' نہ لکھیں۔ سرسید کے نزدیک تاریخ کے بعض بڑے پھل ایسے بھی ہیں جو تعمیر جدید کے حق میں زہریلے ثابت ہو سکتے ہیں۔ ''المامون'' (اشاعت ثانی) کے دیباچے میں انہوں نے لکھا کہ پرانی تاریخ کو از سر نو مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔ اسی سے تاریخ کی تدوین جدید یا مطالعہ جدید کی داغ بیل پڑی۔ انہوں نے لکھا کہ ''ہر فن کے لیے زبان کا طرزِ بیان جداگانہ ہے۔ تاریخ کی کتابوں میں ناول (قصہ) اور ناول میں تاریخانہ طرز کو کیسی ہی فصاحت و بلاغت سے برتا گیا، دونوں کو برباد کر دیتا۔'' سرسید کے خیال میں میکالے کی تاریخ نگاری کا طرز پسندیدہ نہ تھا کیونکہ یہ طرز ادا شاعرانہ تھا۔ تاریخ لکھنے میں سادگی کا لحاظ رکھا جانا چاہیے۔ اسلوب میں سادگی اور ان کا عام طرزِ ادا ہے مگر تاریخ کی بیانیہ نثر کے لیے اس کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔(۲۰)

پروفیسر ڈاکٹر سمیرا الطاف کے مطابق سرسید کی صحافت کی اہم بات علم اور صحافت کا پیوند ہے۔ اس میں ان کا نظریہ یہ بیان کیا گیا ہے۔ ''جائزہ رکھنا چھاپے کی آزادی کا ہے کام ایک دانا گورنمنٹ کا اور برقرار رکھنا اس آزادی کا ہے کام ایک آزاد رعیت کا۔''(۲۱)

سرسید کی صحافت میں دو باتیں بڑی چمک اور تابانی رکھتی ہیں، صحافت کی دیدہ زیبی، ٹائپ کا حسن اور کاغذ کی عمدگی۔

سرسید احمد خاں کی شخصیت کا رنگ دیگر شعرا اور نقادوں کی روح میں جلوہ گر ہے۔ دیکھیے اس ضمن میں ایک طائرانہ جائزہ۔ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ:

> ''مولانا حالی کا ''مقدمہ شعر و شاعری'' تقریباً انہیں خیالات کی زیادہ منظم اور مربوط تفسیر ہے۔ طرزِ ادا میں سادگی کی اہمیت، بے تکلفی اور مدعا نگاری کی ضرورت، شاعر کا اجتماع کے لیے مفید ہونا اور اس کی افادی اور تعمیری صلاحیت یہ سب امور سرسید کے ارشاد کی بازگشت ہیں۔ شبلی کی تنقیدی خیالات میں بہ ظاہر مجددانہ اور مجتہدانہ رنگ نظر آتا ہے۔

مگر غور کرنے سے یہ معلوم ہو گا کہ ان کی تصریحات میں بھی روح سرسید ہی جلوہ گر ہے۔ شعر و ادب کے متعلق کچھ اس قسم کے خیالات سر سیّد سے پہلے محمد حسین آزاد نے بھی ظاہر کیے تھے مگر اردو ادب کی رفتار کو آزادی کے خیالات نے بہت کم متاثر کیا۔ سرسید کے خیالات ایک بڑی تحریک کا حصہ تھے اس لیے وہ تحریک کی طرح ہر طرف چھا گئے۔ ان خیالات کا زیرِ اثر شاعری میں سب سے بڑا نمایاں نمونہ حالی نے قائم کیا جن کی شاعری خصوصاً مسدس گویا تہذیب الاخلاق کی منظوم شرح ہے اور حالی کو اس کا اقرار بھی ہے۔ یہ شاعری ہی نہیں ایک تہذیب کی داستان اور یک نئی تہذیب کی دعوت بھی ہے۔ اس میں وہ سب کچھ ہے جو سرسید کو مطلوب تھا۔"(۲۲)

شبلی کی قومی اور سیاسی شاعری بھی سرسید کی قومی روح کی تربیت یافتہ ہے۔ بعد کے اکثر قومی شاعروں نے انہی بنیادوں پر بہتر اور عالی شان عمارتیں کھڑی کی ہیں۔ اکبر سرسید کے تجدد کے لاکھ مخالف سہی مگر ان کے ذہن کو سرسید کی تحریک ہی سے جلا اور روشنی حاصل ہوئی۔ سرسید کی مخالفت سے انہوں نے اپنی شاعری کی دکان چمکائی ہے مگر ساز و سامان انہیں علی گڑھ ہی سے ملا ہے۔ مخزن میں لکھنے والے اکثر شاعروں کے کلام میں سرسید کی روح جلوہ گر ہے۔ اقبال اگرچہ سرسید کی کلاسیکیت کے خلاف ایک شدید رومانوی احتجاج کا درجہ رکھتے ہیں۔ مگر وہ بھی سرسید کے اثر سے بے نیاز نہیں سرسید نے اپنے تصورات میں نیچر کو جو اہمیت دی ہے اس کا اثر انجمن پنجاب کی نیچر پرستی سے زیادہ دریپا اور مستقل ہے۔ سرسید نے شاعرانہ طور پر ہی نہیں بلکہ علمی اور دینی بنیادوں پر نیچر کے تصور کو پھیلایا۔ "اگر قرآن خدا کا قول ہے تو نیچر خدا کا فعل ہے" یہ دینی اساس خالص علمی اساس سے بھی زیادہ اثر انگیز ثابت ہوئی۔ چنانچہ نیچر سے سرسید کے سب رفقاء نے بڑے لگاؤ کا اظہار کیا۔ شاعری میں میر ٹھی نے نیچر کے مطاہر کو اپنے لیے مخصوص کر لیا تھا۔ گویا ان کی شاعری سرسید کے مندرجہ بالا قول کا منظوم حاشیہ ہے۔

حاصل مطالعہ

سرسید احمد خاں کی زندگی کے انداز و افکار، خیالات و نظریات، جذبات و احساسات اور سماجی و ادبی خدمات سے متعلق نگارشات پر تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے۔ اب اس کا ماحصل پیشِ خدمت ہے۔ پہلے یہ شعر ملاحظہ کیجیے:

اٹھ کہ خورشید کا سامانِ سفر تازہ کریں
نفسِ سوختۂ شام و سحر پیدا کریں

- سرسید اردو نثر کے عہدِ زریں کے معمار بھی تھے اور صاحبِ طرز انشاپرداز بھی۔ سرسید کے افکار کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ قدیم کے مقابلے میں جدید اور ماضی کے مقابلے میں عہدِ حاضر سے زیادہ وابستہ نظر آتے ہیں۔ ان کا ذہن تجدد پسند تھا۔
- سرسید احمد خاں کے فکر و عمل کے میدان خصوصاً تین تھے؛ مذہب، سیاست اور تعلیم۔ سرسید احمد خاں پہلے شخص تھے

جنھوں نے روایت سے بغاوت کرتے ہوئے آزادئ رائے اور حُریتِ خیال کا رواج عام کیا۔

- صحافت کے بارے ان کا نقطۂ نظر "جائزہ رکھنا چھاپے کی آزادی کا، ہے نام ایک دانا گورنمنٹ کا اور برقرار رکھنا اس آزادی کا، ہے کام ایک آزاد رعیت کا۔"
- اگر قرآن خدا کا قول ہے تو نیچر خدا کا فعل ہے۔ بقول علی سردار جعفری "سرسید نے جمہوری ادب کی بنیاد رکھی۔"
- سرسید کے نزدیک عقل پسندی کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔
- زندگی ایک متغیر شے ہے اور تغیر سے مراد یہ ہے کہ زندگی ہر لحظہ ایک نئے روپ میں اور عموماً حسین تر روپ میں ہمارے سامنے متشکل ہوتی رہتی ہے۔ ان رویوں کی نت نئی تبدیل کا نام ترقی ہے۔
- سرسید کی تمام تصانیف میں سے خطبات کو یہ اہمیت حاصل ہے کہ ان کی یہ تصنیف عقیدتِ رسول ﷺ کا بے پناہ جذبۂ محبت اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔
- سرسید وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے دوسرے مذاہب کی کتابوں پر معترضانہ نظر ڈالنے کا جو طریقہ رائج تھا اس کو یکسر بدل دیا۔
- سرسید انگریزی تعلیم کے ساتھ ساتھ انگریزی تہذیب وتمدن کے بھی مداح تھے۔
- سرسید مصلحِ اعظم بھی تھے، قومی مدبر اور ماہرِ تعلیم بھی۔

سرسید کے نزدیک عالمِ اسلام میں مسلمانوں کے خطرات کا علاج سائنسی تعلیم اور ٹیکنالوجی میں پوشیدہ ہے۔ سرسید کا خاص کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے جدید مغربی خیالات کو قبول کرنے کے لیے ذہن کو آمادہ کیا اور جمہوری ادب کی بنیاد رکھی۔ سائنسی عقل پسندی کو اپنی مخصوص کمزوریوں کے باوجود عام کیا اور اردو میں لکھنے پڑھنے کی تمام تحریکیں سرسید کے ان رجحانات کا عکس لیے ہوئے ہیں اور مہدی افادی کے اس خیال سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ نئی نسل تہذیب الاخلاق کی پروردہ ہے، ادب میں بھی اور زندگی میں بھی ۔ جدید زمانے میں کسی فردِ واحد نے نئے اردو ادب اور عام زندگی کو اتنا متاثر نہیں کیا جتنا تنہا سرسید نے کیا۔

سفارشات:

۱۔ سرسید احمد خان کی مایہ ناز شخصیت کی متنوع جہات کو طلبا، اساتذہ، ادبا، فلاسفہ کی مجالس میں ملی تہواروں کے موقع پر اجاگر کیا جائے۔

۲۔ سرسید احمد خاں کی کلیدی خدمات تعلیم، تاریخ، ادب، صحافت، اصلاح، معاشرہ، دین و مذہب کے دائرہ کار میں تخصص کے تحت موضوعِ تحقیق بنائی جائیں۔

۳۔ سرسید احمد خاں کے آثار واحوال، حیات و خدمات، سوانح وعوامل پر معیاری تحقیقی کام کو Inter-disciplinary بین المضامین، بین الکلیہ جاتی انداز میں دیکھا اور پرکھا جائے کیونکہ وہ ماہرِ تعلیم ہیں، ادیب بھی ہیں، صحافی بھی ہیں، مصلحِ قوم بھی ہیں، مفکرِ ملت بھی ہیں، مؤرخ بھی ہیں، مختلف متعلقہ شعبہ جات کے ماہرین اکابرین فاضلین مل کر باہم مشاورت کے اس موضوع پر تحقیق آگے بڑھائیں۔

۴۔ سرسید احمد خاں کے نام پر سرکاری اور پرائیویٹ جامعات میں چیئر کا قیام عمل میں لایا جائے۔

۵۔ سرسید احمد خاں نے اپنے رسالہ "تہذیب الاخلاق" کو جس نہج پہ شروع کیا ان کی یاد میں اسی طرز پہ ایک جریدہ جاری کیا

جائے اور اس کے خدوخال انھی خطوط پر استوار ہوں جس پر سرسید نے اپنا مشہورِ زمانہ تاریخی جریدہ شائع کیا۔

۶۔ سرسید احمد خاں کی قائم کردہ تمام سوسائیٹیز اور تعلیمی اداروں کی کیس سٹڈیز انفرادی تحقیقی مقالات کو مکمل کرایا جائے اور ان کیس سٹڈیز کو عصرِ حاضر کے تعلیمی اداروں کے اجرا کے لیے مدِ نظر رکھا جائے۔

حوالہ جات

۱۔ محمد جہانگیر اکرم، حافظ، سرسید اور ان کے عہد کے تعلیمی نظریات، مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی اُردو، نئی دہلی: شعبہ اُردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، ستمبر ۲۰۱۷ء، ص:۲۵، غیر مطبوعہ

۲۔ عبداللہ سید، ڈاکٹر، سرسید اور ان کے نامور رفقا کی اُردو نثر، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء، ص:۲۳۔۲۵

۳۔ محمد ارشد کیانی، اردو میں جدید نثر نگاری کا ارتقا، لاہور: علمی کتب خانہ، ۱۹۹۰ء، ص:۹۲

۴۔ ایضاً، ص:۱۲۴

۵۔ محمد جہانگیر اکرم، حافظ، سرسید اور ان کے عہد کے تعلیمی نظریات، مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی اُردو، ص:۲۸۳

۶۔ ایضاً، ص:۳۱۵

۷۔ محمد ارشد کیانی، اردو میں جدید نثر نگاری کا ارتقا، ص:۱۲۶

۸۔ محمد زکریا، خواجہ، پروفیسر، تاریخِ ادبیات مسلمانانِ پاکستان وہند، جلد ششم، لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ۲۰۱۴ء، ص:۲۶۵

۹۔ عبداللہ سید، ڈاکٹر، سرسید اور ان کے نامور رفقا کی اُردو نثر، ص:۴۵

۱۰۔ ایضاً، ص:۴۷۔۴۸

۱۱۔ عبداللہ، سید، ڈاکٹر، وجہی سے عبدالحق تک، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۶ء، ص:۱۲۹

۱۲۔ ایضاً، ص:۸۲

۱۳۔ ایضاً، ص:۸۱

۱۴۔ حالی، الطاف حسین، مولانا، حیاتِ جاوید، آگرہ: مطبع مفید عام، ۱۹۰۳ء، ص:۵۰

۱۵۔ محمد ارشد کیانی، اردو میں جدید نثر نگاری کا ارتقا، ص:۱۲۳

۱۶۔ آل احمد سرور، انتخاب: مضامینِ سرسید، دہلی: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۲۰۲۲ء، ص:۷۹

۱۷۔ عبداللہ، سید، ڈاکٹر، سرسید اور ان کے نامور رفقا کی اُردو نثر، ص:۴۸

۱۸۔ حالی، الطاف حسین، مولانا، حیاتِ جاوید، ص:۵۵

۱۹۔ عبداللہ، سید، ڈاکٹر، سرسید اور ان کے نامور رفقا کی اُردو نثر، ص:۸۷

۲۰۔ عبداللہ، سید، ڈاکٹر، وجہی سے عبدالحق تک، ص:۱۰۶

۲۱۔ سمیرا الطاف، ڈاکٹر، پروفیسر، تاریخِ زبانِ ادبِ اُردو، لاہور: فاروق سنز، س ن، ص:۲۶

۲۲۔ عبداللہ، سید، ڈاکٹر، وجہی سے عبدالحق تک، ص:۱۱۱

References in Roman Format

1. Muhammad Jehangir Akram, Hafiz, Sar Syed aur Unn Ke Ehad Ke Taleemi Nazriyaat, Maqala Baraye Ph.D Urdu, New Delhi: Urdu Department, Jamia Millia Islamia, September 2017, P:25
2. Abdullah, Syed, Dr., Sar Syed aur Unn Ke Naamwar Rufqaa Ki Urdu Nasar, Lahore: Sang-e-Meel Publications, 1998, P:23-25
3. Muhammad Arshad Kiani, Urdu Mein Jadeed Nasar Nigari Ka Irteqaa, Lahore: Ilmi Kutab Khana, 1990, P:92
4. Ibid, P:124
5. Muhammad Jehangir Akram, Hafiz, Sar Syed Aur Unn Ke Ehad Ke Taleemi Nazriyaat, Maqala Baraye Ph.D Urdu, P:283
6. Ibid, P:315
7. Muhammad Arshad Kiani, Urdu Mein Jadeed Nasar Nigari Ka Irteqaa, P:126
8. Muhammad Zakriya, Khawaja, Prof., Tareekh-e-Adbiyat-e-Musalmanan-e-Pakistan-o-Hind, Jild Shisham, Lahore: Punjab University, 2014, P:265
9. Abdullah, Syed, Dr., Sar Syed aur Unn Ke Naamwar Rufqaa Ki Urdu Nasar, P:45
10. Ibid, P:47-48
11. Abdullah, Syed, Dr., Wajhi Se Abdul Haq Tak, Lahore: Sang-e-Meel Publications, 2016, P:129
12. Ibid, P:82
13. Ibid, P:81
14. Hali, Altaf Hussain, Molana, Hayat-e-Javaid, Aagrah: Matbaa Mufeed Aam, 1903, P:50
15. Muhammad Arshad Kiani, Urdu Mein Jadeed Nasar Nigari Ka Irteqaa, P:123
16. Aal Ahmad Suroor, Intekhab: Mazameen-e-Sar Syed, Delhi: Educational Book House, 2022, P:79
17. Abdullah, Syed, Dr., Sar Syed aur Unn Ke Naamwar Rufqaa Ki Urdu Nasar, P:48
18. Abdullah, Syed, Dr., Wajhi Se Abdul Haq Tak, P:111
19. Abdullah, Syed, Dr., Sar Syed aur Unn Ke Naamwar Rufqaa Ki Urdu Nasar, P:87
20. Abdullah, Syed, Dr., Wajhi Se Abdul Haq Tak, P:106
21. Sumera Altaf, Dr., Prof., Tareekh Zaban-e-Adab Urdu, Lahore: Farooq Sons, P:26
22. Hali, Altaf Hussain, Molana, Hayat-e-Javaid, P:55